گھریلو تشدُّد (روک تھام اور تحفظ) کا بل

Domestic violence (prevention and protection) Bill,2021

مفتی شعیب عالم
استاذِ جامعہ و نائب مفتی دارالافتاء

(ساتویں اور آخری قسط)

بل پر شق وار تبصرے کے بعد اب اس کی چند موٹی موٹی خامیوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

مصالحت کی مخالفت

خاندان کی بنیاد زوجین کے تعلق پر ہے۔ اگر زوجین کے مابین نزاع ہو جائے تو اس کے لیے قرآن کریم میں ''نشوز، شقاق اور اعراض'' وغیرہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور اس کے حل کے لیے مصالحت پر زور دیا گیا ہے۔ قرآن کریم کی یہ مصالحتی تجویز اس کے اصولوں کے ہم آہنگ ہے، کیونکہ جب وہ عائلی زندگی کی بنیاد صلح وصفائی، عفو و درگزر، حسنِ سلوک، صلہ رحمی اور ایثار و ہمدردی پر رکھتا ہے تو ان اُصولوں کا تقاضا بھی مقدمہ بازی نہیں، بلکہ چشم پوشی ہے اور مخاصمت نہیں، بلکہ مصالحت ہے۔ قرآن پاک کی روشنی میں مصالحت میں خیر ہے اور کوئی ایک فریق صلح کی خواہش ظاہر کرے تو دوسرے کو بھی صلح کے لیے جھک جانا چاہیے۔ ان قرآنی ہدایات کی روشنی میں بہتر تو یہی ہے کہ زوجین کے مابین سمجھوتے کے لیے کسی بیرونی مدد کی ضرورت ہی نہ پڑے اور زوجین ہی صلح وصفائی سے کام لے کر جھگڑا نمٹا دیں، کیونکہ کسی بیرونی فریق کی شرکت سے بسا اوقات نجی احوال بھی اس کے علم میں آجاتے ہیں جس کے بعد گھر کی بات گھر میں نہیں رہتی، بلکہ گھر گھر کہانی بن جاتی ہے اور نہیں تو زوجین کا وقار بیرونی فریق کی نظر میں ضرور کم ہو جاتا ہے، مگر بسا اوقات اس کے بغیر چارہ کار بھی نہیں ہوتا، مثلاً قصور بیوی کا ہو اور شوہر نے اصلاح کے لیے تدریجی مراحل اختیار کر لیے ہوں یا نزاع باہمی ہو اور زوجین خود کوئی حل تلاش نہ کر سکیں تو پھر مخلص اور معاملہ فہم حضرات کے سامنے وجہِ نزاع کا ذکر کر دینا چاہیے۔

ایسے موقع پر میاں بیوی دونوں کی طرف سے ایک ایک نمائندے پر مشتمل ایک مصالحتی کمیٹی قائم کرنی چاہیے جو زوجین کے درمیان اختلاف کو ختم کر کے ان کے درمیان اتفاق کی کوشش کرے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ یُّرِیْدَاۤ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا خَبِیْرًا۔'' (النساء:۳۵)

آیتِ شریفہ مصالحتی کمیٹی کے بارے میں درج ذیل ہدایات پر مشتمل ہے:

❶: اس کمیٹی کی تشکیل حکامِ وقت، زوجین کے اولیاء یا مسلمانوں کی کوئی جماعت یا زوجین کے رشتہ دار کریں گے۔ خود زوجین بھی اس کی تشکیل کر سکتے ہیں۔

❷: حکم کی تعبیر سے معلوم ہوا کہ کمیٹی یا پنچایت ایسے افراد پر مشتمل ہو جو فیصلے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں، چنانچہ وہ ذی علم ہوں، دیانت دار ہوں، معتدل طبیعت کے مالک ہوں، نیک سیرت ہوں اور جھگڑے کے حل کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

❸: کمیٹی دونوں طرف کے ارکان پر مشتمل ہو، تاکہ جانبداری کی بدگمانی پیدا نہ ہو۔

❹: کمیٹی کے ارکان دونوں کے رشتہ دار ہوں، کیونکہ رشتہ دار خیر خواہ ہوتے ہیں، اندرونی معاملات سے اور زوجین کے مزاج سے واقف ہوتے ہیں۔

❺: کمیٹی کا مقصد میاں بیوی کے درمیان مصالحت کرانا ہے۔ یہی اس کمیٹی کی تشکیل کا مقصد ہے، اس سے زیادہ کا مینڈیٹ انہیں حاصل نہیں ہے، البتہ اگر میاں بیوی انہیں اپنا مختار بناتے ہیں اور انہیں فیصلے کا اختیار سپرد کرتے ہیں تو پھر ان کا فیصلہ زوجین کا فیصلہ سمجھا جائے گا۔

❻: کمیٹی خلوصِ دل سے چاہے گی تو زوجین میں موافقت ہو جائے گی۔ اگر صلح کی کوشش ناکام ہو جائے تو کمیٹی کے خلوص میں کمی ہوگی۔

❼: کمیٹی کی نیت، اس کے افعال و کردار سب کچھ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہے۔ اگر وہ غفلت یا سستی برتے گی یا جانبداری کا مظاہرہ کرے گی یا اس کی نیت زوجین میں جوڑ پیدا کرنے کی نہ ہوگی تو اللہ تعالیٰ کو اس کی خبر ہے۔

❽: ''خِفْتُمْ'' (اندیشے) کو بعض نے علم کے معنی میں لیا ہے، یعنی جب زوجین کے درمیان ناچاقی کا علم ہو جائے تو مصالحتی کوشش کا آغاز کر دینا چاہیے اور جنہوں نے اس کو ظن کے معنی میں لیا ہے، ان کے قول کے مطابق تو بس بھنک پڑتے ہی اصلاحی اقدام شروع کر دینا چاہیے۔

❾: قرآن کریم نے خطاب اور ضمائر کے صیغے استعمال کیے ہیں، مگر ان کے مصداق کو متعین

نہیں کیا ہے، اس ابہام کی وجہ سے ایک دنیا آیتِ کریمہ میں سمٹ کر جمع ہوگئی ہے، چنانچہ یہ آیت مختصر ہونے کے باوجود ایک جامع اور مکمل پروگرام پر مشتمل ہے۔ ''فَابْعَثُوْا'' کی مخاطبین کون ہیں؟ ان کو مبہم رکھا گیا ہے، اس ابہام کی وجہ سے حُکّام اس حکم میں داخل ہیں، چنانچہ ان کا فریضہ اگر بگاڑ کو ختم کرنے کا ہے تو بگاڑ پیدا نہ ہونے دینا بھی ان کی ذمہ داری ہے۔ بگاڑ کے انسداد کے شرعی قانون کا نفاذ ضروری ہے، کیونکہ اسی سے فرد کے فرد کے ساتھ تعلقات شرعی ہو سکتے ہیں، ورنہ قطع تعلق کا نتیجہ جس طرح فساد ہے، اسی طرح غیر شرعی تعلق کا نتیجہ بھی فساد ہے۔

بہر حال اس مصالحتی کونسل کا فائدہ یہ ہے کہ گھر کا معاملہ اگر گھر ہی میں حل نہ ہو سکے تو خاندان کی سطح پر حل ہو جاتا ہے اور گلی کوچوں اور چوراہوں میں اس پر تبصروں کی نوبت نہیں آتی اور بالفرض معاملہ عدالت تک جا پہنچے تو عدالت کو بھی حکم یہ ہے کہ فیصلے کے بجائے وہ ایک ثالثی کمیٹی مقرر کرے جو دونوں کے اختلافات کا جائزہ لے اور اپنی رپورٹ پیش کرے۔

مصالحتی کونسل کا یہ طریقہ کار اختلافات کے حل کا فوری اور تیز طریقہ ہے، یہ طریقہ آسان بھی ہے اور مفت ہونے کے علاوہ باعزت اور دیرپا بھی ہے۔ اگر عدالت سے رجوع کیا جائے تو اس کا لگا بندھا طریقہ کار اور متعین اسلوب ہوتا ہے۔ اسے انسانوں سے زیادہ ضابطوں کی اور دلوں سے زیادہ اصولوں کی فکر ہوتی ہے۔ انسان ٹوٹتے ہیں تو ٹوٹ جائیں، مگر ضابطے نہیں ٹوٹنے چاہئیں، کیونکہ وہ اسی کی پابند ہے۔ اس کا فیصلہ بھی ظاہری شواہد پر ہوتا ہے جو کہ ضروری نہیں ہے کہ درست ہوں۔ اگر شواہد درست ہوں اور فیصلہ شواہد کے مطابق ہو، پھر بھی فیصلہ بے رحم چھری ہوتا ہے جو جذبات اور احساسات سے عاری اور رشتوں کی نزاکت سے ناواقف ہوتا ہے اور کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔

عدالتی فیصلہ قطعِ نزاع تو کر دیتا ہے مگر مطمئن بھی کر دے، ایسا ضروری نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فیصلے کے بعد ایک فریق فتح کا پھریرا لہراتا ہوا نکلتا ہے، تو شکست خوردہ فریق بازی کو پلٹنے کے لیے نیا محاذ کھولنے کی تدبیریں سوچنے لگتا ہے۔ اگر وہ قانون کے جبر سے خاموش بھی رہے تو فیصلہ کا کڑوا بیج اس کے دل میں زہریلے برگ و بار لاتا رہتا ہے۔ اگر عدالتی فیصلے ہی خانگی امور میں آئیڈیل انتخاب ہوتے تو قرآن کریم مصالحت کی تجویز نہ دیتا، اسے بہتر نہ قرار دیتا، زوجین کو ثالث کے انتخاب کی ہدایت نہ کرتا اور مصالحت کی حوصلہ افزائی نہ کرتا، احادیث مصالحت کو پسند نہ کرتیں، قاضیوں کو یہ تلقین نہ کی جاتی کہ وہ فیصلے سے پہلے فریقین کو مصالحت کا موقع دیں اور جھوٹ جیسے کبیرہ گناہ کی مصالحتی عمل میں کہنے کی اجازت نہ دی جاتی۔

عدالت کے علاوہ فتوی کے ذریعے بھی نزاع کا حل ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ فتویٰ اسلامی نظامِ عدل

میں نیم عدالتی کارروائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج بھی مسلمانوں کا فتوی کے ادارے پر اعتماد ہے اور ایسے مسلمانوں کی کمی نہیں ہے جو اپنے معاملات میں غیر شرعی قوانین کے بجائے شریعت کو فیصل اور حکم بنانے پر راضی ہیں، مگر عموماً فتوی کا اجراء یکطرفہ موقف پر ہوتا ہے۔ مفتی کا منصب بھی حقائق کی چھان بین نہیں ہوتا ہے اور فتوی کا حصول بھی مصالحت کے نقطۂ نظر سے نہیں، بلکہ حق یا ناحق یا شرعی حکم کی دریافت کے لیے ہوتا ہے۔

عدالت اور فتوی کے بجائے عائلی تنازعات کے حل کے سلسلے میں بہتر حل صلح کا ہی ہے۔ دورِ عثمانی میں باقاعدہ ثالث ہوتے تھے جن کا نام ہی ''مُصلِحون'' تھا اور وہ عدالتوں سے وابستہ ہوتے تھے۔ کئی ممالک نے اس راز کو پالیا ہے اور وہاں عائلی تنازعات کے حل کے لیے تربیتی طریقے وضع کیے گئے ہیں۔ ان ممالک میں خانگی جھگڑوں کو نمٹانے کے لیے زوجین کی باقاعدہ کونسلنگ کی جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں مختلف قوانین میں صلح اور اس سے ملتے جلتے الفاظ کا استعمال ہوا ہے، مگر اس کا قانونی مفہوم متعین نہیں کیا گیا ہے۔ عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء میں طلاق کے بعد مصالحت کی کوششوں کا ذکر ہے، حالانکہ اس عمل کی ضرورت طلاق سے پہلے ہوتی ہے۔

اس مجوزہ بل میں مصالحت کا کوئی طریقہ کار تجویز نہیں کیا گیا ہے۔ اگر بل صرف مصالحت سے خاموش ہوتا تو زیادہ تشویشناک نہیں تھا، مگر المیہ یہ ہے کہ بل مصالحت کے اصولوں کے برعکس سفر کرتا ہے اور اس کی کوشش مصالحتی کاوشوں کو ناکام بنانے کی نظر آتی ہے۔ مصالحت کے لیے اولین شرط یہ ہے کہ فریقین اس کی ضرورت محسوس کریں، لیکن جب ستم رسیدہ پختہ شعور کا مالک نہ ہو، طبیعت خواہشات کی اسیر اور روایات واقدار کی باغی ہو، دوسری طرف جب قانون اپنی پوری قوت کے ساتھ اس کے پشت پر کھڑا ہو اور اس کا ارادہ مدعی علیہ کو نشانۂ عبرت بنانے کا ہو اور اس کے ساتھ متضرر کو آزادی، خلوت میں عدمِ مداخلت، من پسند رہائش، جرمانہ و ہرجانہ اور مالی امداد وغیرہ کے خواب دکھائے گئے ہوں تو وہ مصالحت کی ضرورت کیوں محسوس کرے؟ اور اس پر کیوں کر آمادہ ہو؟

اگر فیملی کے افراد مصالحت کی اہمیت کو جانتے ہوں اور اس کی ضرورت محسوس کرتے ہوں تو وہ باوجود خواہش کے اس میں کامیاب نہیں ہوسکتے ہیں، کیونکہ یہ بل تنازع کے ایک فریق متضرر کو اس طرح اُچک لیتا ہے اور خاندان سے اسے یوں کاٹ لیتا ہے، گویا وہ نہ کسی خاندان کا فرد ہے، نہ وہ کسی کی اولاد ہے، نہ ہی اس کا کسی سے رشتہ ناطہ ہے اور نہ ہی آئندہ کے لیے اسے خاندان یا تعلقات کی ضرورت ہے، گویا وہ کسی آسمانی سیارے سے اُترا تھا اور اب دوبارہ ہمیشہ کے لیے واپس جارہا ہے۔ اگر متضرر کو خاندان سے کاٹنا مقصد نہیں ہے تو پھر ہر نوع کا رابطہ اس سے ممنوع کیوں ہے؟ مدعی علیہ کے رشتہ داروں

کی اس سے ملاقات پر پابندی کیوں ہے؟ دونوں کے درمیان ایک مخصوص فاصلہ برقرار رکھنا کیوں ضروری ہے اور متضرر کو بجائے خاندان کے کسی سنجیدہ، برگزیدہ، عمر رسیدہ اور خیر خواہ شخصیت کے بجائے اپنے محبوب اور دوست کے ساتھ رہنے کا حق کیوں ہے؟

مصالحت اس وقت ممکن ہوتی ہے جب ٹوٹے ہوئے رابطے بحال ہوں۔ رابطوں کی بحالی سے غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں اور فریقین ایک دوسرے کو اپنی رائے سے متفق کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کچھ مانو اور کچھ منواؤ کی بنیاد پر بات آگے بڑھتی ہے اور ایک دوسرے سے وعدے اور یقین دہانیاں اور ضروری ہو تو ضامن یا ضمانت لے کر جھگڑا ختم کر دیا جاتا ہے، مگر جب رابطے ہی منقطع ہوں تو ایک دوسرے کو کیسے قائل کیا جا سکتا ہے؟

اگر دونوں کے ہمدرد درمیان میں آ کر تنازع کو حل کرنا چاہیں تو ثالث بھی سب سے پہلے فریقین کو مذاکرات کی میز پر لاتا ہے، مگر یہ قانون اس کی بھی گنجائش نہیں چھوڑتا ہے۔

اگرچہ اس بل کے تحت وقوع پذیر جرم کو قابل راضی نامہ قرار دیا گیا ہے، مگر بل جو میکنزم تجویز کرتا ہے، اس کے تحت راضی نامہ جو مصالحت ہی کا دوسرا نام ہے، مشکل ضرور نظر آتا ہے۔ بل سروس فراہم کنندہ اور افسرِ تحفظ وغیرہ کی صورت میں جو کردار متعارف کراتا ہے اور تھانہ، پناہ گاہ، شیلٹر ہوم وغیرہ کی صورت میں جن اداروں کو پیش کرتا ہے۔ وہ سب اجنبی لوگ، اجنبی ماحول اور اجنبی جگہیں ہیں، جب کہ مصالحت میں وقت اور مقام کی پابندی نہیں ہوتی، اجنبی لوگ اور اجنبی ماحول نہیں ہوتا ہے، جیسا کہ ذکر ہوا کہ میاں بیوی کے درمیان اختلاف کے وقت قرآن کریم ان کو حکم دیتا ہے کہ اپنی اپنی طرف سے ایک ایک ثالث کا انتخاب کریں اور ثالث ان کے رشتہ داروں میں سے ہوں۔ اگر ثالثان کی خواہش مصالحت کی ہوگی تو اللہ پاک بھی زوجین کے درمیان موافقت پیدا فرما دیں گے۔ جو ہمدردی اور خلوص ایک رشتہ دار دوسرے رشتہ دار کے لیے رکھتا ہے، باوجود کوشش کے ایک اجنبی وہ جذبات اپنے دل میں پیدا نہیں کر سکتا ہے۔ ثالث جب رشتہ داروں میں سے ہوتا ہے تو مصالحت کی کامیابی کے امکانات بہت بڑھ جاتے ہیں، کیونکہ مصالحت کی کامیابی کے لیے درست معلومات کا حصول شرط ہے۔ خاندان کا ممبر ہونے کی حیثیت سے ثالث درست حقائق سے واقف ہوتا ہے اور اگر وہ واقف نہ بھی ہو تو دیگر رشتہ داروں کے ذریعے اس کے لیے درست معلومات تک رسائی آسان ہوتی ہے۔ نجی احوال کے متعلق بھی خاندان کے رکن سے تو کھل کر گفتگو ہو سکتی ہے، مگر اجنبی لوگوں کے سامنے ایسا ممکن نہیں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ خاندان کا فرد ہونے کی حیثیت سے وہ فریقین کی ثقافت، رسم و رواج، کردار، خاندان کے حالات، اور ان کے مزاج سے واقفیت رکھتا ہے۔ وہ طویل نشستوں میں فریقین کا ذہن پڑھ لیتا ہے اور ان کو ایک

درمیانی راستے تک لانے میں کامیاب ہوجاتا ہے، وہ اس مقصد کے لیے دیگر اقارب کی بھی مدد لے سکتا ہے اور فریقین پر اثر ورسوخ رکھنے والی شخصیات کو استعمال کرلیتا ہے، مگر ایک سرکاری افسر کے لیے یہ سب کچھ ممکن نہیں ہوتا ہے۔ ان امور کی وجہ سے ثالث محض رسمی کارروائی انجام نہیں دیتا، بلکہ اس کی شدید خواہش فریقین میں مصالحت کی ہوتی ہے اور اگر مصالحت کے بجائے کوئی اور فیصلہ کرتا ہے تو تمام حقائق کے جائزے کے بعد وہی فریقین کے حق میں مفید ہوتا ہے۔

تادیبِ اولاد

تادیب کا حق جس طرح شوہر کو حاصل ہے، اسی طرح والدین کو بھی حاصل ہے۔ والدین کو یہ حق اس وجہ سے حاصل ہے کہ ان پر اولاد کی تربیت کی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ تربیت بظاہر ایک سادہ سا لفظ ہے اور روزمرہ کی گفتگو میں زبانوں پر بار بار آتا ہے، اس کثرتِ استعمال کی وجہ سے اس کی وسعت اور اہمیت کی طرف نظر نہیں جاتی، حالانکہ یہ لفظ اپنے اندر بہت گہری حقیقت رکھتا ہے۔ یہ لفظ تین بنیادی ذمہ داریوں کی نشان دہی کرتا ہے:

❶: پرورش ونگہداشت، جس کا تعلق جسمانی ضروریات سے ہے۔ فقہ میں اس مقصد کے لیے نان ونفقہ، رضاعت اور حضانت کے ابواب قائم کیے گئے ہیں۔

❷: تعلیم، اس میں دینی ودنیوی حقوق اور ذمہ داریوں کی تعلیم شامل ہے۔

❸: درست شخصیت کی تعمیر، اس کو تزکیۂ نفس سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں۔

ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے شریعت والدین کو تادیب کا حق دیتی ہے، جس سے مراد تنبیہ اور سرزنش ہے اور آخری چارہ کار کے طور پر اس میں مناسب جسمانی سزا بھی شامل ہے۔

تادیب کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب تعلیم وتربیت کے تقاضوں میں کوئی خلل آتا ہے، مثلاً اولاد تعلیم میں سستی کرے یا غفلت برتے جس سے شخصیت کا ظاہر بگڑتا ہے یا معصیت کا مرتکب ہو، بری صحبت میں بیٹھتا ہو یا چوری کرتا ہو جو باطن کے بگاڑ، بدسیرتی اور بدخلقی کی علامت ہے تو تادیب واجب ہوجاتی ہے۔ تادیب چونکہ غلطی کی اصلاح کے لیے ہوتی ہے، اس لیے شریعت اپنے عام مزاج کے مطابق تدریج کے اصول کو بروئے کار لاتی ہے، اس لیے پہلے پہل غلطی کی نشاندہی کرکے سمجھایا بجھایا جاتا ہے اور فوائد ونقصانات سے آگاہ کیا جاتا ہے، بلکہ اگر مصلحت چشم پوشی سے کام لینے کی ہو تو غلطی سے صرف نظر کرلیا جاتا ہے، پھر ڈرانے دھمکانے سے کام لیا جاتا ہے اور اگر یہ حربہ بھی کارگر ثابت نہ ہو تو سختی اور درشتی سے کام لیا جاتا ہے اور ان سب کی ناکامی کے بعد حسب ضرورت ومصلحت جسمانی سزا دی جاتی ہے۔

اگرچہ اولاد کی تادیب جائز ہے، مگر تادیب کے طور پر جسمانی سزا کی اجازت اس وقت ہے،

جب بچے کی عمر سات سال یا اس سے زیادہ ہو، کیونکہ اس سے پہلے ناسمجھی کا زمانہ ہوتا ہے۔ جب بچے کا شعور کچھ پختہ ہو جائے، مگر مکمل پختہ نہ ہو جسے صبی ممیز کہا جاتا ہے تو پھر اس کی تادیب جائز ہے۔ اس حالت کا زمانہ سات سے بلوغت تک رہتا ہے۔ اس مدت میں اگرچہ بچے کی تادیب جائز ہے، مگر اس کا کوئی فعل یا ترکِ فعل خواہ کتنا ہی سنگین کیوں نہ ہو، وہ جرم نہیں ہے اور اس پر فوج داری سزا کا اجراء ناجائز ہے۔ بلوغت کے بعد بچے کا فعل جرم بن جاتا ہے اور اس کو فوج داری سزا دینا بھی جائز ہو جاتا ہے۔

اولاد کے متعلق تادیب کا حق اس پہلو سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ شوہر کو تادیب (ضرب) کا حق ہے، مگر اس پر تادیب کا وجوب نہیں ہے، لیکن اولاد کی تادیب واجب ہے، کیونکہ ان کی تادیب سے مقصود ان کی تعلیم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان معاشرہ روزِ اول سے لے کر آج تک اس کو ایک لازمی ذمہ داری سمجھتا چلا آرہا ہے، گویا یہ ایک مسلمہ روایتی قدر ہے جس کو ممنوع قرار دینا خود جرم تو ہوسکتا ہے، مگر جائز قانون نہیں ہوسکتا ہے۔

یہ بل حقِ تادیب کے اس طور پر خلاف ہے کہ تادیب میں وعظ ونصیحت اور پھر تخویف وتہدید بھی شامل ہے، مگر اس بل کی شقوں کا سہارا لے کر اولاد عدالت پہنچ سکتی ہے کہ انہیں گھریلو تشدد کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔